باسمہ تعالیٰ
جنگ
اور
انسان
محترم پرویز صاحب کی
طلوع اسلام کنونشن
سنہ ۱۹ ۶۳ء
میں تقریر
شائع کردہ
ادارۂ طلوع اسلام
۲۵/بی۔ گلبرگ
لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جنگ اور انسان

جیسا کہ میں نے ایک دفعہ اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا۔

انسان بھی ایک طُرفہ تماشا ہے

اِسے عبادت گاہوں میں محوِ نیاز دیکھو تو آسمان کے فرشتے اس کے ذوقِ عبودیت پہ نثار اور جنت کی حوریں اس کی جھکی ہوئی پیشانی پر تصدق ہوتی ہیں۔ اس کا ایک ایک سجدہ، زمین اور آسمان کو وجد میں لاتا، اور فضائے کائنات میں تھرتھری پیدا کر دیتا ہے۔

اور اگر اسے محبت کے حریمِ ناز میں سر بزانو دیکھو تو کسی کی یاد میں اس کے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو چاند اپنے بلوریں کٹورے میں بھر لیتا ہے کہ وہ شب کی تاریکیوں میں شمع کافوری کا کام دیں۔ آفتاب، اس کے دل کی تپش و خلش سے حرارت مستعار لیتا ہے کہ وہ اس سے نبضِ ہستی میں تموج پیدا کر دے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے سوز و گداز سے، اپنے اندر نئی زندگی محسوس کرتا ہے۔

اور اگر اسے حیرت خانۂ علوم و فنون میں سرگرمِ تحقیق دیکھو تو اس کا فکرِ فلک پیما، زمین کی پستیوں سے آسمان کے راز فاش کرتا اور مہر و مہ و ستاروں پر کمندیں ڈالتا ہے۔ وہ زہر سے تریاق بناتا اور پتھر کو آئینے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کی اختراعاتِ جمیلہ، تہذیب و تمدن کے قصرِ رنگیں میں، نور و نکہت کی ندیاں رواں کر دیتی ہیں۔

لیکن ــــ یہی انسان جب نشۂ قوت سے بدمست، اور ہوسِ خون آشامی سے مدہوش ہو کر اپنے ہی جیسے انسانوں کے خلاف بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح امنڈتا ہے تو عبودیت کا عجز و نیاز، محبت کا سوز و گداز، اور علم و حکمت کا ساز و براق، سب اس کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہے چلے جاتے

ہیں۔ یہ خود اپنے ہاتھوں کے تعمیر کردہ قصر تہذیب و تمدن کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، اور انسان کا خون پانی سے بھی زیادہ ارزاں ہو جاتا ہے۔

اس کی ساری تاریخ، اسی خون ریزی اور آتش باری کی ہولناک داستان ہے۔ یہ جوں جوں علم و عقل میں آگے بڑھتا جاتا ہے، اس کی تباہ کاریوں کی وسعت حدود فراموش ہوتی چلی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ

خوں ریزی کی وسعتیں

جب دارا نے یونان کی طرف لشکر کشائی کی تو اس کے ساتھ صرف دس ہزار فوج تھی۔ جب اسکندر نے ایشیا کی طرف رُخ کیا تو اس کے جلو میں تیس ہزار کا لشکر تھا۔ جب نپولین نے روس پر حملہ کیا تو پانچ لاکھ فوج اس کے زیر کمان تھی۔ گذشتہ جنگ عظیم میں صرف مقتولین اور زخمیوں کی تعداد ایک کروڑ سے زائد تھی۔ اور کہا جا رہا ہے کہ اگر اب کے جنگ چھڑی تو ایک بم، پورے کے پورے کرۂ ارض کو بھک سے اڑا دے گا۔ وَ یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ (۲۷/۵۵)۔ صرف خدا کی ذات باقی رہ جائے گی۔

یہ تو انسان کی سیاسی دنیا کی داستانِ خوں ریز تھی۔ اس کی فکری دُنیا کی طرف آئیے تو وہاں بھی یہ عجیب مجموعۂ تضاد دکھائی دے گا۔ اگر ایک طرف اس نے یہ فلسفہ وضع کیا کہ ایک چیونٹی کا مارنا بھی مہاپاپ (گناہِ عظیم) ہے، اور انسان کو منہ پر کپڑا باندھے رکھنا چاہیئے تاکہ جراثیم، سانس کے ذریعے اندر جا کر ہلاک نہ ہو جائیں اور اس طرح انسان، جیو ہتیا کے جرم کا مرتکب نہ ہو جائے، تو دوسری طرف ہم نیٹشے کے الفاظ میں یہ سنتے ہیں کہ

> Men should be educated for war and women for the recreation of the warriors. Everything else is folly.

مردوں کو سپاہ گری کی تعلیم دینی چاہیئے اور عورتوں کا مقصدِ زندگی، ان سپاہیوں کی تفریح کا سامان بننا۔ اس کے سوا جو کچھ ہے سب بکواس ہے۔ مسولینی کا قول تھا کہ جنگ بالکل اخلاقی چیز ہے۔ ہٹلر کہا کرتا تھا کہ اب ایک نئی دنیا وجود میں آ چکی ہے جس میں جنگ ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ جنگ ہر شے کے ماپنے کا ذریعہ ہے اور قانون وہی ہے جسے ایک سپاہی وضع کرے۔ فرد اور معاشرے کے صرف وہی کام قابلِ ستائش قرار پا سکتے ہیں جو جنگ کی تیاری میں ممد ہوں۔

(HEINRICH HAUSER) کا قول ہے کہ

ہمیں چاہیئے کہ ان تمام اداروں کو توڑ ڈالیں جو انسان کو امن اور

حفاظت کی ضمانت دیتے ہیں۔ زندگی صرف اسی وقت محکم اور سادہ ہوسکے گی جسے بربریت کا عہد کہا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس افراط و تفریط میں، قرآن، اس سلسلہ میں، کیا فلسفہ اور مسلک پیش کرتا ہے؟

امن و سلامتی کا دین

یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں بالعموم ہر شخص امن اور سلامتی چاہتا ہے۔ جو لوگ اس سلسلہ میں کوئی نمایاں کام کرتے ہیں، دنیا کی ہر قوم انہیں واجب العزت سمجھتی اور ان کے جیسے کفرسے کرتی ہے۔ ہر سال کسی نہ کسی کو امن (PEACE) کا نوبل پرائز دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے خدا کی ایک صفت اَلسَّلَامُ اور دوسری اَلْمُؤْمِنُ بتائی ہے۔ اَلسَّلَامُ کے معنی ہیں وہ ذات جس سے ہر شے سلامتی حاصل کرے۔ اور مُؤْمِنُ کے معنی ہیں، امن کی ضمانت دینے والا۔ جس پر بھروسہ کرکے امن اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ خود اُس نظامِ زندگی کا نام جسے قرآن پیش کرتا ہے، اسلام ہے۔ اور جن لوگوں کے ہاتھوں سلامتی کا یہ نظام متشکل ہوتا ہے، انہیں مُؤْمِنُ کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ اُس ضابطۂ حیات (قرآن) کے متعلق، جو اس نظام کا آئین و دستور ہے کہتا ہے کہ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ (۵/۱۶) اس کے ذریعے خدا سلامتی کی راہیں کشادہ کرتا ہے۔ وہ اس کی دعوت کے متعلق کہتا ہے کہ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ (۱۰/۲۵) خدا سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ مومنین کے مآلِ زندگی کے متعلق کہتا ہے کہ لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ (۶/۱۲۷)۔ ان کے لئے سلامتی کا گھر ہے۔ وہ جس معاشرہ میں رہتے ہیں، وہ معاشرہ امن اور سلامتی کا گہوارہ ہے۔ اور اس دنیا سے جانے کے بعد فرشتے ان کا یہ کہہ کر استقبال کرتے ہیں کہ سَلَامٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ (۱۳/۲۴)۔ تم نے دنیا میں، امن و سلامتی قائم رکھنے کے لئے جس استقامت کا ثبوت دیا تھا، اس کے بدلے میں یہاں تمہارے لئے امن و سلامتی کے تحائف ہیں۔ یہی امن و سلامتی کی حسین آرزو ہے جو صبح سے شام تک ہر مسلمان کے وردِ زبان رہتی ہے جب وہ آنے والے کا استقبال "السلام علیکم" کی صدائے نشاط افزا سے کرتا، اور اس کے جواب میں، وعلیکم السلام، کی نشید جاں فزا سنتا ہے۔

فساد ناپسندیدہ ہے

جب معاشرہ کے امن اور سلامتی کی فضا میں بگاڑ پیدا ہو جائے، تو اسے "فساد" کہا جاتا ہے جو خدا کو بے حد ناپسند ہے۔ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (۲/۲۰۵)۔ وہ انسانوں کو تاکیداً حکم دیتا ہے کہ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ (۲/۱۱)۔ زمین

میں فساد مت برپا کرو۔ وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا (۲۸/۸۳)۔ ان کا مسلک، دنیا میں سرکشی اور فساد برپا کرنا نہیں ہوتا۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلام، امن و سلامتی کا پیامبر ہے، اور وہ دنیا میں فساد اور خلفشار کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔ اس کا منتہائے نگاہ، دنیا سے فساد ختم کر کے، عالمگیر امن اور سلامتی کی فضا پیدا کرنا ہے۔

یہاں تک تو بات صاف ہے کہ ہر شخص امن اور سلامتی میں رہنا چاہتا ہے، اور اسلام امن و سلامتی کا پیامبر ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص، دوسروں کو امن کے ساتھ نہ رہنے دے، اور معاشرہ کی سلامتی کو بگاڑنے کی کوشش کرے، تو اس وقت کیا کیا جائے؟ اس کا جواب، ہمارا ہر روز کا تجربہ اور طرزِ عمل دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی حرکات پر اتر آتا ہے تو سب سے پہلے اسے

لیکن سرکشی کا کیا علاج؟

سمجھایا بجھایا جاتا ہے۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہیں آتا تو اسے حوالہٗ پولیس کر دیا جاتا ہے، اور جب عدالت اُسے مجرم پاتی ہے تو اسے قید کر دیا جاتا ہے تاکہ امن پسند لوگ، اس کی شر انگیزی سے محفوظ رہیں۔

یہ تو ہوا کسی کا انفرادی فعل۔ لیکن اگر کوئی قوم اس قسم کی حرکات کرنے لگ جائے تو اس کا کیا علاج؟

عیسائیت کی مروجہ تعلیم یہ کہتی ہے کہ ایسی صورت میں چاہیئے کہ اُس قوم کی زیادتی کو برداشت کیا جائے۔ اس کے سامنے ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ اس کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ اس طرح وہ خود ہی نادم اور پشیمان ہو کر اپنی زیادتی سے باز آجائے گی —— ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینا۔ جو شخص تمہارا کوٹ اتارے، اُسے واسکٹ خود اتار کر دیدینا —— اس طرزِ عمل کو ظالم کی دراز دستیوں کا علاج بتایا جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی تعلیم حضرت عیسیٰؑ کی نہیں ہو سکتی۔ یہ تجربہ پر صحیح ثابت نہیں ہوتی۔ اور خود عیسائیت

عیسائیت کی تعلیم

کی تاریخ اس کی عملاً تردید کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں ڈین انگے (DEAN INGE) جو دنیائے عیسائیت کا ایک نامور ترجمان ہے۔ اپنی کتاب (THE FALL OF IDOLS) میں لکھتا ہے۔

> عدم مدافعت کا اصول، ایک چھوٹے سے گُٹے کے لئے 'ناموافق حالات میں زندگی بسر کرنے کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ لیکن ایک منظم سوسائٹی تشدد کے استعمال سے کبھی مجتنب نہیں رہ سکتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک عیسائی حکومت کو اپنے حدودِ مملکت میں

کسی جرائم پیشہ گروہ کو مغلوب نہیں کرنا چاہیئے۔ اور جب اسے تسلیم کر لیا جائے کہ ایسا کرنا ضروری ہے تو پھر اس حکومت کو دشمن کے حملہ کی مدافعت کرنی بھی ضروری ہوگی۔ فتنہ و فساد کی مدافعت نہ کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں جو کسی آئین و قانون کی پیروی نہیں کرتے۔ آگسٹائن کا بھی خیال تھا کہ ایسے حالات میں جنگ حق بجانب ہوتی ہے ...... عدل کے بغیر سلطنت کیا ہے؟ ایک بڑے پیمانے پر قزاقی (صفحہ ۱۷۵)۔

موجودہ اناجیل میں بھی بعض شہادات ایسی ملتی ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی حقیقی تعلیم ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینے کی نہیں تھی۔ مثلاً انجیل متی کے دسویں باب میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا۔

یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے۔ اور بیٹی کو اس کی ماں سے۔ اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔

مہاتما گاندھی کا اہسا

خود ہمارے زمانے میں، ہندوستان میں، مہاتما گاندھی نے اہسا (عدم تشدد) کا پرچار بڑے شد و مد سے کیا۔ اور اسے ایک خدائی فلسفۂ حیات کے طور پر پیش کیا۔ لیکن جب ملک میں عام بد امنی پھیلی، اور عورتوں تک کی عزت خطرہ میں نظر آئی تو انہیں بمجبوری یہ کہنا پڑا کہ

بجائے اس کے کہ ہندوستان کی عورتیں محسوس کریں کہ وہ بے بس ہیں، اس سے کہیں بہتر ہے کہ انہیں ہتھیاروں کا استعمال سکھایا جائے اور عورتوں میں خنجر اور ریوالور رکھنے کا رواج ترقی پذیر ہو۔ (ہری جن۔ بابت ۱/۲۴ ۱۹۴۲)

یعنی اہسا کے پجاری کو یہاں تک کہنا پڑا کہ مرد تو ایک طرف، عورتوں کو بھی تشدد کا استعمال کرنا چاہیئے۔

یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیش نظر، علامہ اقبالؒ نے، اسی زمانے میں کہا تھا کہ

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

اور اسی رشی کے چیلے، آجکل بھارت میں جو کچھ کر رہے ہیں، وہ اس کے پیش کردہ فلسفے کے بطلان کی زندہ شہادت ہے۔

قرآن سطحی جذبات کو اپیل کر کے دوسروں کو وقتی طور پر خوش اور مطمئن نہیں کرتا۔ وہ زندگی کے

حقائق کا سامنا کرتا، اور ان کا عملی حل پیش کرتا ہے۔

برائی کی روک تھام بھلائی سے

اس نے، سب سے پہلے تلقین کی کہ جہاں تک ہو سکے، برائی کو بھلائی سے روکنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۴۱/۳۴﴾

برائی کی مدافعت نہایت حسن کارانہ انداز سے کرو۔ اس سے یہ ممکن ہے کہ تمہارے اور جس شخص کے درمیان عداوت ہے، وہ تمہارا گرم جوش دوست بن جائے۔

دوسرے مقام پر اس نے مؤمنین کی صفت یہ بتائی ہے کہ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ ﴿۲۸/۵۴﴾۔ وہ برائی کو بھلائی سے روکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ برتاؤ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن سے نادانستہ برائی سرزد ہو جائے اور شریفانہ طرز عمل ان پر عمدہ اثر کرے۔

جرم کی سزا

لیکن اگر اس سے کام نہ چلے، اور جس سے شرافت کا سلوک کیا جاتا ہے، وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھائے، تو قرآن اس کی اجازت دیتا ہے کہ اس کی زیادتی کی روک تھام قوت سے کی جائے، لیکن اس کا خیال رکھا جائے کہ سزا جرم سے بڑھنے نہ پائے۔ اس کا ارشاد ہے وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ جرم کی سزا، جرم کے مطابق ہونی چاہیئے۔ لیکن یہاں بھی قرآن ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر یہ موقع پر بھی دیکھا جائے کہ مجرم اپنے کئے پر نادم ہے اور اگر اسے معاف کر دیا جائے تو اس کی اصلاح ہو سکتی ہے، تو ایسا کرنا بہتر ہے فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ ۚ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۲/۴۰﴾۔ غور کیجئے! قرآن اس شخص کو بھی ظالم قرار دیتا ہے جو ایسے مجرم کو معاف نہ کرے جو اپنے کئے پر نادم ہو اور معاف کر دینے سے اس کی اصلاح ہو سکتی ہو۔ اس سے اگلی آیت میں، اس نکتہ کی مزید وضاحت کر دی گئی ہے جہاں فرمایا کہ وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ؕ۔ جو شخص اس ظلم کا بدلہ لیتا ہے جو اس پر کیا گیا ہو، اس پر کوئی الزام نہیں۔ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ الزام تو ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زیادتی

کرتے ہیں۔ یہ لوگ الم انگیز سزا کے مستحق ہیں۔ اس کے بعد ہے وَ لَمَنۡ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ؒ (۴۲/۴۳) لیکن جو شخص دیکھے کہ عفو اور درگزر کر دینے سے مجرم کی اصلاح ہو سکتی ہے، تو وہ اگر ہمت سے کام لے، اور مجرم کو سزا سے بچا لے تو یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔

قرآنی اقدامات

آپ نے غور فرمایا کہ معاشرہ میں امن قائم رکھنے کے لئے قرآن، کیا کیا اقدامات تجویز کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

(i) دوسروں کے امن میں خلل ڈالنے والوں کو، سب سے پہلے، حسن سلوک سے رام کرنے کی کوشش کرو۔ ان میں اگر شرافت کا مادہ ہے تو یہ حسن سلوک ان کی اصلاح کر دے گا۔

(ii) اگر یہ تدبیر مؤثر ثابت نہ ہو، تو انہیں ان کے جرم کی سزا دی جائے۔ لیکن سزا جرم سے بڑھنے نہ پائے۔

(iii) اگر دیکھا جائے کہ مجرم اپنے کئے پر نادم ہے، اور معاف کر دینے سے اس کی اصلاح کا امکان ہے تو اُسے معاف کر دیا جائے۔

(iv) لیکن جو لوگ ناحق ظلم اور زیادتی کریں، اور معاشرہ کے امن کو بگاڑیں۔ اور ان میں اصلاح کے امکانات بھی نہ ہوں، تو انہیں سزا دی جائے۔ یعنی ان کی زیادتی کی روک تھام کے لئے قوت کا استعمال کیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں، السّلام۔ اور المؤمن، خدا کی صفات بتائی ہیں، ان کے ساتھ المھیمن العزیز الجبّار المتکبّر (۵۹/۲۳)۔ کا بھی اضافہ کر دیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ قیام امن و سلامتی کے لئے بعض اوقات قوت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔

قانون کے ساتھ شمشیر کا نزول

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ تنہا قانون، امن قائم رکھنے کے لئے کافی نہیں۔ اس کے ساتھ قوت کی بھی ضرورت ہے۔ سورۃ حدید میں ہے۔ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ۔ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا۔ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ۔ اور ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین بھی نازل کیا اور میزانِ عدل بھی لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ؏ تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔ وَ اَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡهِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷/۲۵)۔ اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فولاد بھی پیدا کیا جس میں شدت کی سختی ہوتی ہے اور یہ لوگوں کے لئے بڑی منفعت بخش چیز ہے کیونکہ اسی

سختی سے دنیا کا امن قائم رہتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تُو نے — کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگردار
اس بیت کا یہ مصرعۂ اول ہو کہ جس میں — پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

جس قانون کی پشت پناہ قوت نہیں، وہ قانون وعظ و نصیحت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ قانون مؤثر ہی اسی صورت میں ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ قوتِ نافذہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام، جو ایک نظامِ زندگی کا نام ہے، عملی شکل اختیار کرنے کے لئے، ایک آزاد مملکت کا وجود ضروری سمجھتا ہے۔ اگر اس کی اپنی آزاد مملکت نہ ہو تو وہ "مذہب" بن کر رہ جاتا ہے۔ دین کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ اور اس مملکت کی حفاظت، وہ اپنا اولیں فریضہ قرار دیتا ہے۔ اسی لئے اس نے جماعتِ مومنین سے تاکیداً کہا ہے کہ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ...... (۸:۶۰)۔ جہاں تک بھی تمہارے بس میں ہو، قوت پیدا کرکے اور گھوڑوں کے رسالے تیار رکھ کر، دشمنوں کے مقابلے کے لئے اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو اور اپنی سرحدوں کی پوری پوری حفاظت کرو، تاکہ، اس طرح مستعد رہ کر، تم اپنے اور نظامِ خداوندی کے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو، اور وہ تمہاری طرف قدم بڑھانے کی ہمت نہ کر سکیں۔

لیکن یہ قوت، اُس مملکت کی حفاظت کے لئے ہوگی جس میں نظامِ خداوندی نے ایک عملی شکل اختیار کرکے "امنِ عالم کو قائم رکھنا ہے۔ اسے کمزور قوموں کو لوٹنے اور کچلنے کے لئے صرف نہیں کیا جائیگا۔ اس حقیقت پر قرآن کا وہ مقام شاہد ہے جہاں سب سے پہلے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ آیئے غور سے سنئے۔

جنگ کی پہلی اجازت

نبی اکرمؐ اور جماعتِ مومنین نے تیرہ برس مکہ میں گزارے، اور مخالفین کے جور و ستم کو کامل صبر و سکون سے برداشت کیا۔ ان کی طرف سے ہر برائی کی مدافعت بھلائی سے کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس سے انہوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ ان کی طرف سے شدائد اور مصائب کا سلسلہ دن بدن زیادہ ہوتا چلا گیا۔ حتّٰی کہ، حق پرستوں کی اس مختصر سی جماعت نے اپنا گھر بار چھوڑ کر دُور، مدینہ میں جا کر پناہ لی۔ لیکن ان مخالفین نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا، اور تہیہ کر لیا کہ یا تو انہیں مجبور کر دیا جائے کہ وہ اپنی دعوت کو چھوڑ دیں اور یا ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ ایک لشکرِ جرار لے کر ان کے خلاف چڑھ دوڑے۔ اب اس جماعت کے سامنے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ یہ تھا وہ مقام جب انہیں پہلی مرتبہ میدانِ جنگ میں آنے کی اجازت دی گئی۔ سورۂ حج میں ہے۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ

ظُلِمُوْا ؕ یہ لوگ جن پر اس قدر مظالم کئے گئے ہیں، اب بالآخر انہیں جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ گھبرائیں نہیں وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ۔ خدا ان کی مدد کرنے پر یقیناً قادر ہے۔ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ۔ ان پر مظالم اس انتہا تک پہنچ چکے تھے کہ ان بیچاروں کو ان کے گھر بار سے بھی نکال باہر کیا گیا۔ اور ناحق ایسا کیا گیا۔ ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اس جرم کی پاداش میں انہیں ان کے وطن تک سے نکال دیا گیا۔ اور اب جبکہ یہ دیارِ غیر میں آکر پناہ گزیں ہوئے ہیں تو انہیں یہاں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا جاتا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی سرکش قوتوں کو بدلگام ہونے دیا جائے یا ان کی روک تھام کا کچھ انتظام کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک بات بالکل واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ۔ اگر اللہ ایسا انتظام نہ کرے کہ سرکش قوتوں کی روک تھام دوسرے لوگوں کے ہاتھوں ہو، تو پھر دنیا میں کوئی امن کی جگہ باقی ہی نہ رہے، حتیٰ کہ مختلف اہلِ مذاہب کی پرستش گاہیں تک مسمار کر دی جائیں — راہبوں کی کوٹھڑیاں۔ یہودیوں کے صومعے، دیگر اقوام کی عبادت گاہیں۔ مسجدیں جن میں خدا کا نام بکثرت لیا جاتا ہے۔ یہ سب ڈھا دی جائیں۔ اس مقصد کے لئے، ایسی جماعتوں کا وجود ضروری ہے جو عندالضرورت اپنی جان تک دے کر لوگوں کی مذہبی آزادی، برقرار رہنے کا انتظام کریں۔ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ (۲۲/۳۹-۴۰)۔ جو جماعت، اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے خدا کی مددگار بنے گی، خدا یقیناً اس کی مدد کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔

اسلامی مملکت کی غرض و غایت

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جماعت، جسے سرکش قوتوں کی روک تھام کے لئے جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے، اگر اسے غلبہ حاصل ہو گیا تو اس کا طرزِ عمل کیا ہوگا؟ کیا اس کا غلبہ بھی اسی طرح، کمزوروں اور ناتوانوں کو کچلنے کے لئے ہوگا؟ قطعاً نہیں۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (۲۲/۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں تمکن حاصل ہو گیا تو یہ ایسا نظام قائم کریں گے جس میں لوگ قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں گے، اور ہر شخص کو سامانِ نشوونما حاصل ہوگا۔ یہ اُن باتوں کا حکم دیں گے جنہیں خدا کا قانون صحیح قرار دے گا اور اُن سے روکیں گے جنہیں وہ ناپسندیدہ کہے گا۔ ان کی حکومت

میں، ہر معاملہ کا آخری فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔ لہٰذا، اس میں کسی قسم کی سرکشی اور دھاندلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

دوسرے مقام پر کہا گیا کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ اگر اللہ سرکش قوتوں کی روک تھام کا انتظام نہ کرتا رہے تو دنیا میں فساد ہی فساد نظر آئے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲/۲۵۱)۔ لیکن خدا اس طرح اقوامِ عالم کو تباہ نہیں کرانا چاہتا اس لئے اس نے ایسی جماعتیں بھی پیدا کر دی ہیں جو اپنا خون دے کر امنِ عالم قائم رکھیں۔

لہٰذا، قرآن کریم کی رُو سے، جنگ کی اجازت ان لوگوں کو دی گئی ہے جنہیں سرکش قوتیں کہیں جینے نہ دیں۔ وہ ان قوتوں سے مدافعت کے لئے جنگ کر سکتے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان بچاروں میں اتنی سکت نہ ہو کہ یہ اپنی مدافعت کر سکیں تو پھر کیا ہو؟ کیا اس صورت میں انہیں، اُن جفا جو درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں۔ ان مظلوموں اور

مظلوموں کی مدد کیلئے

لاوارثوں کی مدد کی جائے اور اُن کی حفاظت کے لئے عند الضرورت، میدانِ جنگ میں اُترا جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جماعتِ مومنین سے کہا جاتا ہے کہ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں نکلتے۔ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ تم سنتے نہیں کہ کمزور اور ناتواں مرد۔ عورتیں۔ بچے کس طرح چلا چلا کر پکار رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے باشندوں نے اس قدر ظلم برپا کر رکھا ہے۔ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ (۴/۷۵)۔ وہ فریاد کر رہے ہیں کہ ہمارے لئے کہیں سے کوئی سرپرست پیدا کر دے۔ کوئی مددگار بھیج دے جو ہمیں ان کے مظالم سے نجات دلائے — کیا ان کی فریاد تمہارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی، یا تم نے سمجھ لیا ہے کہ چونکہ اب ہم محفوظ ہو گئے ہیں اس لئے ہمیں لڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔ تمہارا مقصدِ زندگی اپنی جان کی حفاظت ہی نہیں بلکہ دنیا میں ہر مظلوم کی حفاظت ہے۔ ظلم کی روک تھام، تمہارا فریضۂ زندگی ہے۔ اس لئے جہاں سے مظلوم کی آواز اٹھے گی، تمہیں اس کی مدد کے لئے پہنچنا ہوگا۔ یہی جنگ "قتال فی سبیل اللہ" اللہ کی راہ میں جنگ ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ (۴/۷۶) جماعتِ مومنین، ظلم کی روک تھام کے لئے، خدا کی راہ میں جنگ کرتی ہے۔ اور جو لوگ حق و صداقت سے انکار کرتے ہیں، وہ ظلم اور

سرکشی کے لئے جنگ کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے یہاں جنگ کے مقاصد میں اصولی اور بنیادی فرق بتا کر

جائز اور ناجائز جنگ

یہ واضح کر دیا کہ کس مقصد کے لئے جنگ، جائز بلکہ ضروری ہو جاتی ہے، اور کن مقاصد کے لئے ناجائز اور باطل۔ اگر جنگ، ظلم مٹانے اور مظلوم کی مدد کرنے کے لئے ہو، تو جائز۔ اگر ظلم برپا کرنے کے لئے ہو تو ناجائز۔ ظلم کسے کہتے ہیں، اسے قرآن کریم نے مختلف مقامات پر نہایت وضاحت سے خود ہی بیان کر دیا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی گروہ، کسی بات کو یونہی ظلم قرار دے کر آمادۂ پیکار ہو جائے اور اپنے آپ کو برسرِ حق قرار دے لے۔ قرآن اپنی کسی بات کو مبہم اور وضاحت طلب چھوڑتا ہی نہیں۔ لیکن یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق میں مختلف مواقع پر بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ اس مقام پر صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ جن امور کو قرآن "بنیادی حقوقِ انسانیت" قرار دیتا ہے، کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو ان سے محروم کر دینا، ظلم قرار پائے گا؛ اور اس کی روک تھام جماعتِ مؤمنین کا فریضہ ہوگا، خواہ یہ ظلم کسی پر بھی کیوں نہ ہو رہا ہو۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی تمیز نہیں ہوگی۔

یہاں تک سوال، جنگ کی ضرورت، مقاصد، جواز یا عدمِ جواز کا تھا۔ اب دیکھئے کہ جنگ کی صورت میں، قرآن، جماعتِ مومنین پر کن شرائط کی پابندی ضروری قرار دیتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ عدل کا

دشمن سے عدل

دامن، جنگ میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا جائے گا۔ دشمن سے بھی عدل کیا جائیگا۔ اس کا تاکیدی حکم ہے کہ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۚ اِعْدِلُوْا ۛ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ (۵/۸)۔ دیکھنا! کسی قوم کی تمہارے خلاف دشمنی، تمہیں کہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ دشمن سے بھی عدل کرو۔ یہی طرزِ عمل تقویٰ سے قریب تر ہے — عدل ظلم کی ضد ہے۔ لہٰذا، جب ظلم کے معنی ہیں، کسی کو انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم کر دینا، تو عدل سے مراد ہوگی، ان حقوق کی حفاظت کرنا۔ بنا بریں، قرآن کریم کی رو سے، جنگ کی حالت میں بھی دشمن کو حقوقِ انسانیت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

دنیا کا عام چلن یہ ہے کہ جنگ اور معاشقہ میں ہر حربہ جائز ہے۔ (EVERY THING IS FAIR IN LOVE AND WAR) لیکن قرآن اسے حدیثِ بے خبراں قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک عدل کو ہاتھ سے چھوڑ دینا، جنگ میں بھی جائز نہیں۔

اب آگے بڑھئے۔ جنگ ہو یا صلح، ان میں معاہدات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے

معاہدات کی اہمیت

کہ دنیا کا امن، معاہدات کے بھروسے پر قائم رہتا ہے۔ معاہدہ باہمی اعتماد کی ضمانت ہوتا ہے۔ لیکن جب اصول یہ قرار دے لیا جائے کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے، تو پھر معاہدات کا احترام کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونان کے مشہور مقنن، سولن نے کہا تھا کہ معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو تو پھانس لیتا ہے لیکن قوت والے کے سامنے پرکاہ کی سی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور مغربی سیاست کا امام، میکیاوَلی یہ تعلیم دیتا ہے کہ

> عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب دیکھے کہ کوئی عہد یا پیمان اس کے خلاف جاتا ہے۔ یا جن مصلحتوں کے پیش نظر وہ معاہدہ کیا گیا تھا وہ باقی نہیں رہیں، تو اسے بلا تامل توڑ ڈالے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نظر فریب دلائل بھی بہم پہنچائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ فریب جس سے مقصد حاصل ہو، قابلِ تعریف ہوتا ہے۔

اور اسی امام کے مقتدی، فریڈرک دوم کا قول ہے کہ

> حکمتِ عملی یہ نہیں کہ پہلے سے متعین کر لیا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حکمتِ عملی یہ ہے کہ حسبِ موقعہ، جو صورت اپنے فائدے کی نظر آئے، اسے اختیار کر لیا جائے۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ دوسری سلطنتوں سے معاہدات کر کے اپنے ہاتھ نہیں باندھ لینے چاہئیں۔ اپنے آپ کو آزاد رکھنا چاہیئے۔ اگر کبھی کسی سے معاہدہ کر بھی لیا جائے تو اسے حسبِ مصلحت توڑ ڈالنا چاہیئے۔

اٹلی کے میکیاوَلی سے بہت پہلے، بھارت (ہندوستان) میں ایک میکیاوَلی گزرا ہے جس کا لقب ہی کوٹلیہ (KAUTILYA)۔ یعنی فریب کار ــــ ہے۔ وہ اپنی کتاب، ارتھ شاستر میں لکھتا ہے کہ

> معاہدات کو وقتی مصلحتوں کے تابع رہنا چاہیئے اور عندالضرورت ان سے بلا توقف پھر جانا چاہیئے۔ لیکن یہ سب کچھ اس انداز سے کرنا چاہیئے کہ اپنوں اور بیگانوں میں سے کسی کو تمہاری چال کا علم نہ ہونے پائے[1]۔

ان سب کے برعکس قرآن کریم نے معاہدات کی پابندی پر جس قدر زور دیا ہے، اس پر اس کا ایک ایک متعلقہ

---

[1] ہندوستان، اپنے اس سیاسی گرو کے ارشاد (نصیحت) پر کس طرح حرفاً حرفاً عمل کر رہا ہے، اس پر اس کی پندرہ سولہ سال کی سیاسی تاریخ شاہد ہے۔ اور ایک ہندوستان پر ہی کیا موقوف ہے۔ دنیا کا ہر ملک یہی کچھ کر رہا ہے۔

معاہدہ کا احترام

مقام شاہد ہے۔ اس نے اصولی تاکید کی کہ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (۵/۱)۔ عہد و پیمان کی پوری پوری پابندی کرو۔ دوسرے مقام پر ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ معاہدہ کرنے کے بعد تم ایفائے عہد کے لئے ' صرف اس پارٹی کے سامنے جوابدہ ہو جس کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا ہے۔ تم اس کے لئے اپنے خدا کے سامنے بھی جوابدہ ہو۔ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۴)۔ عہد کی پابندی کرو۔ یاد رکھو! تم سے عہد و پیمان کے متعلق پوچھا جائے گا۔

قرآن کے ان تاکیدی احکام کی روشنی میں' جماعت مومنین کی طرف سے' معاہدات میں خیانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن اس باب میں ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر فریق مخالف' خیانت پر اتر آئے' تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کا جواب عام طور پر یہی دیا جائے گا کہ پھر تم بھی اسی قسم کا طرز عمل اختیار کرو۔ لیکن قرآن کی یہ تعلیم نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً اگر تمہیں کسی پارٹی کی طرف سے عہد شکنی کا خطرہ ہو تو تم انہیں اطلاع دیئے بغیر یونہی معاہدہ کالعدم نہ کر ڈالو۔ فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ۔ تم انہیں اس کی اطلاع دے کر معاہدہ ختم کرو۔ اور اس طرح دونوں فریق برابر کی سطح پر آ جاؤ۔ "عَلٰى سَوَاءٍ" کے یہ معنی بھی ہیں کہ اگر اس طرح یک لخت معاہدہ توڑنے سے انہیں کوئی نقصان پہنچتا ہو تو اس کی تلافی کر کے' ان سے مساوات کا سلوک کرو۔ اس لئے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (۸/۵۸) اللہ معاہدات میں خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

عملی مثالیں

ہماری تاریخ کے اس عہد ہمایوں میں' جب قرآنی نظام قائم تھا' کسی بین الاقوامی معاہدہ میں خیانت کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس زمانے میں' انفرادی عہد و پیمان کا بھی کس حد تک احترام کیا جاتا تھا اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے۔ بدر کے میدان میں حالت یہ تھی کہ ادھر تین سو تیرہ' بے ترتیب نہتے' اور بے ساز و یراق مجاہدین کی صف۔ مقابل میں قریش کا جم غفیر۔ اتنے میں دیکھا کہ دو صحابی' کہیں سے دوڑے دوڑے آئے اور مجاہدین کی صفوں میں شریک ہو گئے۔ اُس وقت حالات ایسے نازک تھے کہ اسلامی لشکر میں ایک سپاہی کا اضافہ بھی موجب تقویت تھا۔ مجاہدین کو اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ حضورؐ کے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ وہ کسی اور طرف سے آ رہے تھے۔ راستے میں کفار نے روکا کہ تم محمدؐ کی مدد کے لئے جا رہے ہو۔ انہوں نے انکار کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اس جہاد میں شرکت نہیں کریں گے۔ اس طرح وہ میدان جنگ تک پہنچ سکے ہیں۔ حضورؐ نے سنا تو فرمایا کہ جب تم نے ان سے جنگ میں عدم شرکت کا وعدہ کیا ہے تو اس کا ایفا کرنا ضروری ہے۔ تم جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے۔ فکر نہ کرو۔ ہماری اللہ مدد کرے گا۔

یہ تو پھر بھی ایسے عہد کی پابندی ہے جو، بہ حالات مجبوری ہی سہی، مخالفین سے کر لیا گیا تھا۔ قرآن کریم اس باب میں اس سے بھی دو قدم آگے جاتا ہے۔ ہجرت کے بعد، ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ بعض عورتیں مسلمان ہو گئیں۔ لیکن ان کے خاوند، ہنوز غیر مسلم تھے۔ ان کفار کی طرف سے ان مسلمان بیویوں پر جو مظالم ہوتے ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔ یہ عورتیں اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر، کسی نہ کسی طرح ہجرت کر کے مدینہ میں آ جاتی تھیں۔ اور اس طرح ان کے مظالم سے چھٹکارا حاصل کر لیتی تھیں۔ ان عورتوں کے متعلق قرآن نے کہا کہ انہیں واپس تو نہ بھیجو کیونکہ ان حالات میں، ان مسلم عورتوں کا، ان کفار کے نکاح میں رہنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، لیکن وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا (۶۰/۱۰) انہوں نے ان کے نکاح پر جو کچھ خرچ کیا تھا، وہ انہیں ادا کر دو۔ غور کیجئے! آپ کو ایفائے عہد اور عدل و انصاف کی، اس قسم کی مثال کہیں اور بھی ملتی ہے؟

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے، جس قوم سے جنگ چھڑ جائے، اس جنگ کو کب تک جاری رکھا جائے؟

صلح

قرآن نے کہا ہے کہ وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا۔ فریقِ مخالف جس وقت بھی صلح کی طرف جھکے تم اس کی طرف جھک جاؤ۔ اُس وقت یہ نہ کہو کہ ہماری فتح ہونے لگی تھی تو دشمن نے صلح کی درخواست پیش کر دی۔ اب ہم صلح کیوں کریں۔ ہم انہیں مفتوح و مغلوب بنائیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اندازِ نگاہ غلط ہے۔ جنگ سے تمہارا مقصد نہ مالِ غنیمت تھا نہ کشورکشائی۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ سرکش قومیں اپنی سرکشی سے باز آ جائیں۔ سو وہ جس وقت بھی سرکشی چھوڑ کر، قانون کے سامنے جھک جائیں، تمہارا مقصد حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد جنگ جاری رکھنے کے معنی کیا ہیں؟ وَ اِنْ یُّرِیْدُوْٓا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ (۸/۶۲)۔ اگر بفرضِ محال، وہ صلح کی درخواست کی آڑ میں تمہیں دھوکا دینے کا ارادہ رکھتے ہوں، تو تمہیں پھر بھی گھبرانا نہیں چاہیئے۔ قانونِ خداوندی تمہاری حفاظت کے لئے کافی ہے۔ تم اپنی طرف سے پوری پوری احتیاطی تدابیر اختیار کرو۔ لیکن ان کی صلح کی درخواست کو اس بدگمانی کے ماتحت مسترد نہ کرو کہ وہ اس باب میں نیک نیتی سے کام نہیں لے رہے۔

اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ صلح کے لئے آمادہ نہ ہوں، تو جنگ کب تک جاری رکھی

جنگ کب تک جاری رکھی جائے

جائے۔ اس کے لئے کہہ دیا کہ وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (۸/۳۹)۔ جب تمہیں یقین ہو جائے کہ وہ فتنہ فرو ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ جنگ کی گئی تھی، تو جنگ ختم کر دو۔ اس لئے کہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، جنگ سے مقصد فتنہ ختم کرنا تھا۔ لفظ فتنہ کے اندر ہر قسم کی سرکشی۔ استبداد۔ جور و ستم۔ مذہب کے معاملہ میں سختی اور زبردستی سب آ جاتے ہیں۔

یہ تو رہا صلح کی صورت میں، یا فتنہ فرو ہو جانے کی شکل میں جنگ کا اختتام۔ لیکن قرآن کریم، جنگ کے دوران میں، امن و سلامتی کی فضا پیدا کرنے کے لئے ایک ایسی تدبیر اختیار کرتا ہے کہ جب نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو وجد میں آجاتی ہے۔ جنگ ابھی صورت میں جاری رکھی جا سکتی ہے کہ فریقین اپنی اپنی قوم اور سپاہیوں کے دل میں، فریق مخالف کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات برابر مشتعل کرتے رہیں۔ اگر کسی طرح جنگ میں وقفہ پیدا کر دیا جائے، تو جذبات کا یہ اشتعال مدھم پڑ جاتا اور پھر ختم ہی ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ اس آگ کو بھڑکا نا مشکل ہوتا ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے، ہمارے زمانہ میں متارکہ (یا (CEASE -FIRE) کا طریق وضع کیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے آج سے بہت پہلے، متارکہ کے اصول کو قوانین جنگ کے ضابطہ میں داخل کر دیا تھا۔ اس نے کہا کہ بین الاقوامی معاہدہ کی رُو سے، یہ طے کر لینا چاہیئے کہ، سال میں کچھ مہینے ایسے رکھے جائیں گے جن میں جنگ بہر حال ملتوی کر دینی ہوگی، خواہ وہ کہیں بھی ہو رہی ہو، مِنۡهَاۤ اَرۡبَعَةٌ حُرُمٌ (۹/۳۶)۔ سال کے بارہ مہینوں میں چار ایسے ہیں جن میں لڑائی یکسر بند رہے گی۔ ظاہر ہے کہ جب، سال میں کچھ وقت کے لئے لڑائی بہر حال بند ہو گی تو جذباتِ منافرت و عداوت کی آگ کی شعلہ زنی خود بخود ماند پڑ جائے گی اور یہ فضا قیامِ امن و صلح کے لئے بڑی سازگار ہوگی۔

جنگ کا التوا

جنگ کے قیدی

جنگ کے سلسلے میں ایک اہم سوال جنگ کے قیدیوں کا ہوتا ہے۔ دنیا میں یہ روش، زمانۂ قدیم سے چلی آرہی تھی کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا جاتا تھا۔ نزولِ قرآن کے وقت، عربوں میں یہی رواج تھا۔ چنانچہ ان کے معاشرہ میں، غلام اور لونڈیاں عام ملتی تھیں اور اسے ذرا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے آکر یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ کسی انسان کو، غلام بنا لینا، اُسے حق انسانیت سے محروم کر دینا ہے جو بہت بڑا جرم ہے۔ اس لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ فَاِذَا لَقِيۡتُمُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فَضَرۡبَ الرِّقَابِ۔ جب مخالفین سے تمہارا مقابلہ ہو، تو جیسا کہ جنگ میں ہوتا ہے، ان کی سرکوبی کرو۔ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثۡخَنۡتُمُوۡهُمۡ فَشُدُّوا الۡوَثَاقَ۔ پھر جب وہ مغلوب ہو جائیں تو انہیں قید کر لو۔ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعۡدُ وَاِمَّا فِدَآءً (۴۷/۴)۔ اس کے بعد یا تو انہیں بطور احسان چھوڑ دو۔ اور یا فدیہ لے کر۔ آپ دیکھئے کہ بات کس قدر صاف ہے۔ جنگ کے قیدیوں کو آزاد کرنا ہوگا۔ اگر تمہارے قیدی دشمن کے ہاں ہیں، تو اُن کے مبادلہ میں انہیں رہا کر دو، یا کچھ زرِ فدیہ لے کر۔ اور یا محض احسان کے طور پر انہیں آزاد کر دو۔ بہر حال انہیں آزاد کرنا ہے۔ جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن کریم میں یہی ایک آیت ہے۔ اس

ہیں آپ دیکھیے کہ انہیں غلام اور لونڈیاں بنا لینے کا اشارہ تک نہیں۔ اور ایسا ہو بھی کس طرح سکتا تھا۔
وہ قرآن جو فَكُّ رَقَبَةٍ (۹۰/۱۳) ۔یعنی غلاموں کو آزاد کرانے کو جماعتِ مومنین کا فریضہ قرار دیتا ہے۔ جو جنگ
کی ضرورت ہی اس لئے قرار دیتا ہے کہ جن لوگوں کو حقوقِ انسانیت سے محروم کر دیا گیا ہے' انہیں وہ حقوق واپس
دلائے جائیں۔ جو واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا غلام
اور محکوم بنائے۔ کیا وہ قرآن اس کا حکم دے گا کہ جنگ میں قید ہونے والے انسانوں کو غلام اور لونڈیاں بنا کر
انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح بیچا جائے! سبحان اللہ تعالیٰ عما یصفون۔ جب تک جنگ کے قیدی نظام
اسلامی کی تحویل میں رہیں گے' ان کی حیثیت سرکاری مہمانوں کی ہوگی۔ اس لئے کہ وہ قیدی ہو کر بھی انسان تو رہتے
ہیں' اس لئے انہیں حقوقِ انسانیت سے کسی صورت میں بھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس دوران میں ان سے کس قسم
کا سلوک ہوگا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جنگ بدر کے قیدیوں میں ایک شخص ابو عزیز تھا۔ اس کا بیان ہے
کہ میں جس انصاری کے گھر میں بطور مہمان رکھا گیا تھا ان کی حالت یہ تھی کہ وہ صبح شام کھانا لاتے' تو کھانا میرے
سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوروں پر گزارہ کرتے۔ مجھے شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا' لیکن وہ
اسے ہاتھ نہ لگاتے' اور زبردستی مجھے کھلا دیتے۔

انہی قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمر تھا جو فصیح اللسان ہونے کی وجہ سے' عام مجمعوں میں' نبی اکرمؐ
کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ یہ تجویز پیش کی گئی کہ اس شخص کے سامنے کے دو دانت اکھڑوا دیے جائیں تاکہ آئندہ
تقریر کرنے کے قابل نہ رہے۔ لیکن حضورؐ نے اس کی اجازت نہ دی۔

جنگ بدر کے قیدیوں کو زرِ فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ جو ناداری کی وجہ سے زرِ فدیہ نہ دے سکے' ان
سے کہا گیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ یہی ان کا فدیہ ہو جائے گا۔ جو ایسا بھی نہیں کر سکتے
تھے' انہیں احساناً چھوڑ دیا گیا۔ جن سے زرِ فدیہ لیا گیا تھا' ان سے بھی جاتے وقت کہہ دیا گیا کہ اِنْ يَّعْلَمِ
اللّٰهُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ (۸/۷۰) اگر اس کے
بعد' اس مملکت کے متعلق تمہارے دل میں خیر سگالی کے جذبات پائے گئے تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے' تمہیں اس
سے بہتر واپس دیا جائے گا اور تمہاری حفاظت کا سامان بھی کر دیا جائے گا۔

"غلامی اور اسلام" ایک مستقل موضوع ہے جس پر تفصیل سے گفتگو کسی دوسرے وقت کی جا سکے گی۔

اس مقام پر ضمناً اتنا واضح کر دینا کافی ہوگا کہ قرآن کریم میں' غلاموں اور لونڈیوں (مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ)
کے ضمن میں جس قدر احکام اور ہدایات ہیں' وہ ان غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں جو نزولِ قرآن کے
وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمام احکام ماضی کے صیغے (PAST TENSE)

میں ہیں- مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ- یعنی جو اس سے پہلے غلام بنائے جا چکے تھے- یہ نہیں کہا گیا کہ جنہیں تم اس کے بعد غلام بناؤ' اُن کے متعلق یہ احکام ہیں- قرآن نے اُن غلاموں اور لونڈیوں کو جو اس وقت اس معاشرہ میں موجود تھے' آہستہ آہستہ یا آزاد کرا دیا اور یا انہیں مختلف خاندانوں کا جزو بنا دیا- اور اس کے بعد غلامی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا- لیکن اس بدقسمتی کا کیا علاج کہ ہمارے ارباب مذہب' اب بھی بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ اسلام میں دشمن کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لینے کی اجازت ہے- اور اگر اب بھی پاکستان کی جنگ کسی اور ملک سے ہوئی تو ہم ان کے مردوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنائیں گے- وہ کہتے ہیں کہ

> حکومت کو اختیار ہے کہ (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) چاہے رہا کر دے- چاہے ان سے فدیہ لے- چاہے ان کا تبادلہ مسلمان قیدیوں سے کر لے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں- اور چاہے انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انہیں اپنے استعمال میں لائیں-
>
> (تفہیم القرآن - از ابو الاعلیٰ مودودی صاحب- صفحہ ۳۴۰)

اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں-

> جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں یہ شرط نہیں کہ وہ اہل کتاب ہی میں سے ہوں- ان کا مذہب خواہ کوئی ہو، بہرحال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی تو جن کے حصے میں وہ آئیں وہ ان سے تمتع کر سکتے ہیں-
>
> (تفسیر تفہیم القرآن- صفحہ ۳۴۰)

یعنی نکاح تو صرف مسلمان عورتوں سے یا اہل کتاب کی عورتوں سے ہو سکتا ہے' کفار و مشرکین کی عورتوں سے نکاح نہیں ہو سکتا- لیکن جنگ میں گرفتار شدہ لونڈیوں کے لئے یہ بھی شرط نہیں کہ وہ اہل کتاب سے ہوں- اس کے بعد لکھتے ہیں-

> جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد پر چار کی پابندی لگائی ہے اس طرح لونڈیوں کی تعداد پر نہیں لگائی-

حتیٰ کہ جن لوگوں کے حصے میں یہ لونڈیاں آئیں گی انہیں اس کا بھی اختیار ہوگا کہ استعمال کرنے کے بعد انہیں دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیں- چنانچہ اس باب میں تحریر ہے کہ

> اس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو

> ان سے فدیہ وصول کر لے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔
>
> (تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۳۲۳)

یہ ہے جنگ میں گرفتار شدہ قیدیوں اور ان کی عورتوں کے ساتھ وہ سلوک جسے ہمارے یہ حضرات' اسلام کا منشاء اور حکم قرار دے کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں[1]۔

بہرحال' یہ بات ضمناً سامنے آگئی تھی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن نے حکم یہ دیا کہ جنگ کے قیدیوں کو یا تو فدیہ لے کر رہا کر دو اور یا بطور احسان۔

پناہ میں آنے والے

یہ تو ان لوگوں کے متعلق ہے جو مغلوب و مفتوح ہو کر' گرفتار ہو جائیں۔ لیکن جو لوگ' مسلمانوں کی پناہ میں آنا چاہیں' ان کے متعلق قرآن کا فیصلہ' اس کی کشادہ نگہی کی زندہ شہادت ہے۔ آجکل ایک نئی ٹیکنیک رائج ہوئی ہے جسے (BRAIN-WASHING) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو شخص تمہارے قابو آجائے ——— خواہ وہ تمہارے اپنے لوگوں میں سے ہو اور اس کے خلاف کوئی بدگمانی ہو' یا دشمن کا کوئی آدمی ——— اسے دردناک عذاب کی بھٹیوں میں سے اس طرح گزارو کہ اس کے تمام سابقہ خیالات اس کے دماغ سے محو ہو جائیں اور وہ اسی طرح سوچنے لگ جائے جس طرح تم چاہو۔ اس کے برعکس دیکھئے کہ قرآن کریم کی تعلیم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْهُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلٰمَ اللّٰهِ۔ اور اگر مخالفین (مشرکین) میں سے کوئی شخص تم سے پناہ مانگے تو اسے اپنے ہاں پناہ دو۔ پھر اسے قرآن سناؤ۔ اگر قرآن کی تعلیم اسے اپیل کرے اور وہ دل کے کامل اطمینان اور سکون کے ساتھ اسے قبول کرنا چاہے تو خیر۔ لیکن اگر وہ اس کے بعد چلا جانا چاہے تو اسے روکو نہیں۔ بلکہ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ۔ اسے' اپنی حفاظت میں' اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْلَمُوْنَ (۹/۶)۔ اس لئے کہ یہ لوگ جاہل ہیں۔ جانتے نہیں کہ قرآن انہیں کیا مقام دینا چاہتا ہے۔ لیکن قرآن کسی سے زبردستی نہیں منوایا جاتا۔ اس لئے اگر یہ بطیب خاطر قرآن کو ماننا نہیں چاہتے' تو انہیں' اپنی حفاظت میں' ان کے مامن تک پہنچا دو ——— آپ نے غور فرمایا کہ اس باب میں قرآن کی تعلیم کس قدر بلند اور انسانیت ساز ہے[2]؟

---

[1] تفصیل ان امور کی' ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "قتل مرتد اور غلام اور لونڈیاں" میں ملے گی۔

[2] قرآن تو پناہ گزین مشرک کے متعلق یہ حکم دیتا ہے کہ اگر وہ قرآن سننے کے بعد' اسے برضا و رغبت (بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا قرآن کریم جنگ کو انسان کی تمدنی زندگی کے لئے لاینفک قرار دیتا ہے یا ایسے معاشرہ کا بھی تصور دیتا ہے جس میں جنگ کا امکان نہ رہے۔ وہ

جنگ کا خاتمہ

ایسے معاشرہ کا تصور دیتا ہے جو آیت اوپر درج کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب تمہیں حق کی مدافعت کے لئے میدان جنگ میں نکلنا پڑے تو دشمن کی سرکوبی کرو۔ اور جب ان کی طاقت ٹوٹ جائے تو بقیۃ السیف کو قید کر لو۔ اور قیدیوں کو فدیہ لے کر یا احساناً چھوڑ دو۔ اس کے بعد حتیٰ تضع الحرب اوزارھا (۴۷) تا آنکہ خود جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔ دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے قرآن جس جنتی معاشرہ کا تصور پیش کرتا ہے اس میں ہر طرف سے سلاماً سلاماً کی زندگی بخش اور امن افروز صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اس میں ہر انسان، دوسرے انسان کی سلامتی کا آرزومند ہوتا ہے۔ وہ ایسی انسانیت ساز فضا کس طرح پیدا کرتا ہے جس میں بدامنی کا خدشہ تک نہ ہو ایک الگ موضوع ہے جو تفصیل چاہتا ہے۔ اسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا سکتے ہیں۔ اس وقت صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ وہ ان غیر فطری حدود و خطوط کو مٹا کر، جن کی بنا پر انسان مختلف گروہوں اور قوموں میں بٹ رہا ہے، تمام انسانوں کی ایک عالمگیر برادری متشکل کر دینا چاہتا ہے اور اس کی بنیاد ایک مشترکہ آئیڈیالوجی قرار دیتا ہے، جسے دنیا کا ہر انسان علیٰ وجہ البصیرت اختیار کرے۔ جب تک ایسی فضا پیدا نہ ہو، وہ ان سرکش قوتوں کے مقابلہ کے لئے، جو دوسروں پر ظلم کریں، جنگ کو ناگزیر قرار دیتا ہے —— خواہ یہ ظلم جماعت مومنین کے خلاف ہو، یا دنیا کے کسی اور انسان یا انسانوں کے گروہ کے خلاف۔ قرآنی نقطۂ نگاہ سے جنگ کا مقصود، دنیا سے ظلم مٹا کر اس کی جگہ نظامِ عدل و احسان قائم کرنا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ترمذی کی ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جنگ کا مقصد یہ ہے کہ ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے حق کے سامنے جھکا دیا جائے۔ اسی طرح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ سے پوچھا

اس کی عملی شکل

گیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لیے لڑتا ہے۔ ایک شخص شہرت کے لئے لڑتا ہے۔ ایک شخص بہادری کے لئے لڑتا ہے۔ ایک شخص ذاتی انتقام کے لئے لڑتا ہے۔ ان میں سے کس کا جہاد صحیح ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) تسلیم نہ کرنا چاہے تو اسے کچھ نہ کہو۔ اسے اپنی حفاظت میں، اس کے ہاں پہنچا دو۔ اس کے برعکس ہمارے ارباب شریعت کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان ان باتوں سے مطمئن نہ ہو جنہیں وہ اسلام کہہ کر منوانا چاہتے ہیں، اور اس لئے وہ انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ تو اسے قتل کر دیا جائے۔ (اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں)۔

مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَاءَ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

جو اس لئے لڑتا ہے کہ دنیا میں خدا کا قانون غالب رہے، اس کی جنگ "اللہ کی راہ میں" ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین صرف اپنے گروہ کے مفاد کا تحفظ کرتے ہیں۔ اور چونکہ انسان مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، اس لئے ان کے باہمی مفاد میں تصادم ہوتا ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ جنگ ہے۔ خدا، رب العالمین۔ تمام انسانوں کا یکساں نشو و نما دینے والا ہے، اس لئے اس کے عطا کردہ قوانین کی رو سے، تمام انسانوں کے مفاد کا تحفظ ہو جاتا ہے۔ اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر امنِ عالم کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔ اس بنیاد کو توحید کہا جاتا ہے — یعنی تمام انسانوں پر ایک خدا کے قوانین کا اقتدار۔ جو نظام اس بنیاد پر متشکل ہوتا ہے، اسے قرآن کریم دین کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی تمام انسانوں کے لئے ایک نظامِ زندگی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا احساس اب رفتہ رفتہ، خود مغرب کے مفکرین کو بھی ہوتا جا رہا ہے۔ مثلاً پروفیسر الفریڈ کوبن اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILISATION) میں عصرِ حاضر کے ہمہ گیر اضطراب پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد آخر میں لکھتا ہے کہ

> دنیا کے مصائب کا جو حل سامنے آ رہا ہے وہ یہی ہے کہ ایک عالمگیر مملکت کی تشکیل کی جائے۔

مسٹر ایمری ریوز (EMREY REVES) اس نکتہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے کہ

> کھلے کھلے الفاظ میں، بیسویں صدی کی قیامت خیزیوں کے بعد انسان لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کرۂ ارض کو کسی ایک اقتدار کے تابع لانا ضروری ہے۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح، جمہوری انداز سے اس اقتدارِ واحد کی تشکیل کریں۔ اس کے لئے، ان بنیادی اصولوں کا اعلان کرنا چاہیئے جن پر یہ اقتدار قائم ہوگا۔ اور اس کے بعد لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنا چاہیئے تاکہ یہ مقصود خون ریزی کے بغیر حاصل ہو جائے۔ (ANATOMY OF PEACE)

یہ خیال اب دنیا کے چیدہ چیدہ مفکرین تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ عام ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ مسٹر (W. A. GAULD) نے اپنی کتاب (MAN, NATURE & TIME) میں کچھ عرصہ پہلے لکھا تھا کہ

> مجھے تسلیم ہے کہ "گھر اور وطن" کا خیال سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے لیکن ایک عالمگیر انسانی معاشرہ کی رکنیت کا تصور ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیئے۔

> .... ایک آنک اس قسم کے عالمگیر نظام کا احساس پورا زیادہ شدّت سے ابھر کر سامنے نہیں آیا' اس لئے اس کے متعلق زیادہ حسنِ ظن قبل از وقت ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت کہ کم و بیش ہر ملک میں ایسے افراد موجود ہیں جن کے دل میں یہ خیال کروٹیں لے رہا ہے' اس امر کی ضمانت ہے کہ کچھ وقت کے بعد' یہ خیال عملی شکل اختیار کر لے گا۔

اگر اس قسم کے عالمگیر نظام کا احساس زیادہ شدّت سے ابھر کر سامنے نہیں آیا' تو اس کی ذمہ دار (فلھذا' انسانیت کی بارگاہ میں مجرم) وہ قوم ہے جسے اس عالمگیر نظام کا تصور' آج سے چودہ سو سال پہلے دیا گیا تھا' قرآن نے اُس زمانے میں کہا تھا کہ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳)۔ انسانی معاشرہ کی آخری شکل یہی ہوتی ہے کہ تمام انسان ایک عالمگیر برادری بن جائیں۔ اس کے علاوہ' دنیا میں امن و سلامتی کی کوئی صورت نہیں۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے تمام نوعِ انسان کے لئے دین —— یعنی نظامِ زندگی —— بھی ایک تجویز کیا گیا۔ قرآن سے پہلے' مختلف انبیاء کرامؑ' کسی خاص قوموں کی طرف آتے تھے۔ نبی اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہوا کہ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (۷/۱۵۸)۔ ان سے کہہ دو کہ میں تمام نوعِ انسان کی طرف رسول ہوں۔ یہی وہ بنیاد ہے' جس پر انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ خود قرآن کریم کے متعلق بھی کہا گیا کہ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ (۱۰/۵۷)۔ اے ساری دنیا کے انسانو! تمہارے پاس خدا کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات آ گیا ہے جس میں تمہاری تمام الجھنوں کا علاج ہے۔ انسانی مشکلات کا علاج یہی ہے کہ تمام انسان ایک برادری کی شکل میں زندگی بسر کریں اور اس کا طریق یہ ہے کہ ان سب کا ضابطۂ قوانین ایک ہو۔ یہ تھا وہ تصورِ حیات جو امتِ مسلمہ کو چودہ سو سال پہلے دیا گیا تھا' لیکن اس نے اس تصور کو اس طرح پس پشت ڈال رکھا ہے کہ آج جبکہ دنیا کی دیگر اقوام کے دل میں یہ خیال' کسی نہ کسی انداز سے' کروٹیں لے رہا ہے' یہ اس سے اس طرح بے بہرہ ہے گویا اس کی آواز تک کبھی اس کے کانوں میں نہیں پڑی تھی۔ لیکن قرآن کے ان تصورات پر کسی خاص قوم کی اجارہ داری تھوڑی ہے کہ کوئی دوسرا ان میں شریک نہیں ہو سکتا؟ یہ تو سورج کی روشنی کی طرح' فضائے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جس کا جی چاہے ان سے بہرہ یاب ہو جائے۔

> ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
> قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

پاکستان کا خطۂ زمین اسی مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہ اس عالمگیر نظامِ انسانیت کا اولیں گہوارہ

بنے اور یہاں سے اس شجرِ طیب کی شاخیں پھوٹیں جو دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں پر امن و سلامتی کا سایہ کریں۔ یہی وہ نظام تھا جس کے متعلق اعلان کیا گیا تھا کہ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ آمِنًا (۳/۹۷)۔ جو اس میں داخل ہو گیا، اسے امن نصیب ہو جائے گا۔ اور

اس نظام کا گہوارہ

جس کی خصوصیت یہ بتائی گئی تھی کہ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (۵/۹۷)۔ یہ انسانیت کے قیام کا باعث ہے۔ یہی وہ امنِ عالم کی ضمانت دینے والا نظام ہے کہ اگر سرکش قوتیں، عالمگیر مفادِ انسانیت کے خلاف، اپنے ذاتی مفاد کی خاطر، اس کے قیام کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جائیں، تو انہیں راستے سے ہٹایا جائے اور اس کے لئے اگر جنگ ناگزیر ہو، تو اسے اسی طرح روا رکھا جائے جس طرح، ڈاکٹر ایسی انگلی کو مجبوراً کاٹ ڈالتا ہے جس کا ناسور لاعلاج ہو چکا ہو، اور جس کا زہر سارے جسم میں سرایت کئے جا رہا ہو۔ قرآن، قوت کے استعمال کی اسی مقصد کے لئے اجازت دیتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے — صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے — عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر — ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

"دین کی حفاظت" سے مراد ہی عالمگیر انسانیت کے نظامِ امن و سلامتی کی حفاظت ہے۔ اسلام میں اسی مقصد کے لئے جنگ کی اجازت ہے۔ جو جنگ، استبداد اور جوع الارض کی تسکین کے لئے کی جائے، وہ جنگ حرام ہے۔

صلح شر گردد چو مقصود است غیر — گر خدا باشد غرض، جنگ است خیر

گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند — جنگ باشد قوم را نا ارجمند

(اقبالؒ)